ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی

پاکستان میں سماجی تبدیلیاں اور منٹو کے افسانے

This paper deals with the sociological changes in Pakistan, described by Saadat Hassan Manto in his Short Stories. Manto analyzed the Identity situation and its impact on the society before and after 1947.The researcher focused on his stories specially "Gormukh Singh ki wasiyat" "Akhri Saloot" "Titiwal ka kutta" "Sahaey" and "Yazeed. This paper also deals with the violent behavior of the society after 1947 and highlights the Manto's opinion in this regard.

''معتوب منٹو ، رجعت پسند منٹو،فحش نگار منٹو،غیر ترقی پسند منٹو،لاشوں کی جیبوں سے افسانے نکالنے والا منٹو،بے رحم اور سفاک منٹو، نرگیست پسند منٹو،ذہنی عدم توازن کا شکار منٹو،سماج پر بوجھ منٹو۔۔۔'' نہ جانے اس طرح کے کتنے من چاہے اور من پسند تمغے اپنی زخمی روح پر سجائے منٹو یہ کہتا ہوا اس جہان سے رخصت ہوا کہ اب یہ ذلت ختم ہونی چاہیے ۔آج اسی منٹو کو کیا ترقی پسند ، کیا رجعت پسند، کیا سرکاری و نیم سرکاری ادارے ،جامعات ،اخبارات ، ٹی وی چینلز ، میں ،آپ ہم سب یاد کر رہے ہیں اور شاید اس یاد آوری میں کہیں نہ کہیں کوئی خاص طرح کا احساس جرم بھی شامل ہے۔ہمارا حافظہ بھی کچھ بہت اچھا نہیں کہ اس نے کہا تھا کہ اگر آنے والے وقت میں میرے افسانوں کو وہی اہمیت دی گئی جو آج علامہ اقبال کے اشعار کو دی جارہی ہے تو یقین کیجیے میری روح کو سخت کوفت ہو گی۔بہر طور، سرکاری سطح پر ۲۰۱۲ء کو منٹو کا سال قرار دیا گیا ہے۔اس برس کی مناسبت سے منٹو کے فکر وفن پر ، اس کی ذات شریف پر کئی سیمینا ز، کانفرنسیں ،خصوصی تقریبات،توسیعی خطبات ، رسائل و جرائد کے خصوصی نمبر،لکشمی مینشن کو قومی ورثہ بنانے کی تجاویز،منٹو کے زیرِ استعمال رہنے والی اشیاء کی حفاظت، افسانوی کلیات کی اشاعت میں رنگا رنگی ،سٹیج ڈرامے اور فلم فیسٹیول وغیرہ کا انعقاد بڑے زوروں پر ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ہم سب مل کر اپنے کسی مورثی زخم پر خود ہی مرہم رکھ رہے ہیں کہ جس کا درد ہنوز باقی ہے۔یہ اہم سماجی تبدیلی کا اشارہ ہے کہ ہم نے بالاخر معافی نامے تحریر کرنا شروع کر دیئے ہیں ، اپنے سے پہلی نسل کے تحریر کردہ اس متن کے حواشی میں اختلافی نوٹ بھی درج کرنا شروع کر دیئے ہیں کہ جن کے باعث منٹو نے اپنی عمر کے آخری حصے میں عصمت چغتائی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ اس کے سوا اور کیا کہوں کہ پاکستان میں اب تک زندہ ہوں۔بزرگوں کے مخطوطوں پر اس عہد کے یہ حواشی پاکستان کے سماجی رویوں میں ایک روشن تبدیلی کا عنوان ہیں ۔منٹو کے باب میں سماج کے رویے میں یہ تبدیلی خود منٹو کے فن کی فتح ہے۔

اگر میں غلطی پر نہیں تو اس برس کی تقریبات کا لاہور میں آغاز انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے سے ہوا کہ جس میں عابد حسن منٹو، ڈاکٹر انوار احمد،ڈاکٹر سعادت سعید،سعید ابراھیم،ڈاکٹر ضیاء الحسن، ڈاکٹر قاضی عابداور دیگر کئی صاحبان فکر وفن نے منٹو پر اپنے تنقیدی مقالات پیش کیے اور منٹو کو یاد کیا۔ میرے خیال میں انجمن ترقی پسند مصنفین ، پاکستان کا منٹو کو یاد کرنا اور ایک بڑی

تقریب کا اہتمام کرنا اپنی جگہ ایک اہم اشارہ ہے کہ جس کی تفصیل اس یک جائی کا لطف غارت کر دے گی ۔اس لیے کچھ نہیں کہتا بس اتنا کہنا کافی ہے کہ منٹو کو انجمن ترقی پسند مصنفین ، پاکستان نے یاد کیا ۔اس تقریب میں پڑھے جانے والے سبھی مقالے اہم تھے لیکن سعید ابراھیم کا خاصا طویل مقالہ ہمارا اجتماعی کفارہ ثابت ہوا۔انھوں نے ایک طورخود کلامی کے انداز میں کہا کہ ہم سے غلطی ہوئی جو منٹو پر ترقی پسند رسائل کے دروازے اس عہد میں بند کیے گئے،اسے رجعت پسند کہنا،جنس پرستی کا دھبا لگا کر اسے اپنی صفوں سے نکالنا، اس کے نام کھلے خط لکھنا یہ سب غلط تھا۔ بلا شبہ یہ عالی ظرفی اور ذہنی بلوغت کا ثبوت ہے کہ آج ہم کچھ اعترافات بھری محفل میں بھی کر رہے ہیں،بھلے یہ اعترافات باقاعدہ تنظیمی اعلامیہ نہ سہی ۔ابھی یہ سال ختم نہیں ہوا اور تقریبات کا سلسلہ جاری رہنا ہے، رسائل و جرائد کے خصوصی شمارے سامنے آنے ہیں ، دیکھیں کیا گزرے ہیں قطرے پہ گہر ہونے تک۔

دوسری ایک بامعنی تقریب ایک چھوٹے سے خطے ننکانہ صاحب میں ہوئی ۔سکھوں کے اس مقدس مقام پر منٹو کو یاد کرنا اس لیے بھی خوشگوار تجربہ ثابت ہوا کہ منٹو کے افسانوں میں اہم کردار سکھ ہیں ۔یہ تقریب سکھ برادری کی طرف سے نہیں تھی بلکہ وہاں کی بار ایسوسی ایشن کے مرکزی ہال میں یہ تقریب منعقد ہوئی اور اس تقریب کے کرتا دھرتا وہاں کے ایک نامور وکیل تھے۔تقریب کے دوران میں مجھے منٹو کا ''زحمتِ مہرِ درخشاں'' بڑی شدت سے یاد آیا کہ جس میں منٹو نے اپنے افسانوں پر دائر مقدمات کی ایک طرح سے روداد لکھی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تب منٹو کو کوئی وکیل میسر نہ آیا تھا،البتہ بقول منٹو گورنمنٹ کالج کے کچھ طلباء مدد کو ضرور آئے تھے، اس صورت میں منٹو نے اپنا مقدمہ خود لڑا،لڑا بھی کیا بس خاموش ہو کر سزا سننے کے انتظار میں کھڑے رہے۔اب یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ وکلاء نے اس اہم موقع پر منٹو کو تنہا کیوں چھوڑا لیکن اس برس کی مناسبت سے بار ایسوسی ایشن کے ایک حلقے نے منٹو کو ایک دورافتادہ خطے میں یاد ضرور کیا۔

ابھی کچھ دن ہوئے الحمراء آرٹس کونسل ، لاہور نے منٹو پر ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا،منٹو فلم اور ڈرامہ فیسٹیول منایا گیا۔ اکادمی ادبیات ، پاکستان کی لاہور شاخ نے بھی منٹو کو یاد کیا۔ ان تقریبات اور اقدامات سے کچھ حد تک اندازہ ہوتا ہے کہ شاید برہمن کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور یہ سال منٹو شناسی کے لیے نہ سہی ، ہمارے حوالے سے خود شناسی کا یہ سال اچھا ہوا کہ ہم نے منٹو کے ساتھ کیا کیا۔غیر اہم اور بہ ظاہر غیر متعلق باتیں نہایت اہم ہوا کرتی ہے کہ انہی سے ارتقاء کا منظر سامنے آتا ہے۔ہوسکتا ہے کہ ادبی تقریبات کے دعوت ناموں پر مینارِ پاکستان کے ساتھ علامہ اقبال اور منٹو کی تصاویر کا ایک ساتھ شائع ہونا معمولی سی بات ہو لیکن میرے خیال میں پاکستان کے سماجی شعور میں تبدیلی کا احساس شاید اس دعوت نامے کے علاوہ کہیں اور اس طور نہ ملے۔ایسے ہی بہ ظاہر غیر متعلق بات کہ راقم کو جب منٹو کے افسانوی مجموعوں کی تلاش میں کتب خانوں سے رابطہ کرنا پڑا تو اس کا کوئی مجموعہ کتب خانوں میں دستیاب نہیں تھا ، سبھی کے سبھی طلبہ و طالبات کے پاس تھے ۔اب کشور ناہید کی طرح کوئی طالب علم منٹو کو نصابی کتب کے درمیان رکھ کر شاید نہیں پڑھتا، سماجی رویے کی یہ تبدیلی معنی خیز ہے اور ڈاکٹر انوار احمد کے خیال میں پاکستان میں بدلتا ہوا یہ سماجی شعور ان طاقتوں کے لیے شاید فکر مندی کا باعث ہو کہ جن کی عافیت قوم کو بے شعور رکھنے میں ہے۔

اس طور دیکھا جائے تو پاکستان کے ترقی پسند مصنفین، سرکاری و نیم سرکاری ادارے، جامعات،اخبارات، رسائل و جرائد، اشاعتی منصوبے، میں آپ ہم سب مل کر جس طرح منٹو کے حوالے سے ماضی کے متون پر حواشی میں اختلافی نوٹ درج کر ہے

ہیں انہی سے آنے والا کل ہمارے ہاں سماجی تبدیلی کی نشانیاں تلاش کرے گا۔سماجی عمل کی اس کروٹ میں منٹو کے اخلاص کی فتح ہوئی ہے۔منٹو اگر آج پورے قد کے ساتھ تمکنت سے کھڑا نظر آتا ہے تو کسی بیساکھی کے بغیر۔اس کے پاس نہ تو نظریاتی تنظیم کی قوت تھی کہ جو گاہے بہ گاہے مصنوعی تنفس کے ساتھ اسے زندہ رکھنے کی کاوش کرتی اور نہ ہی اس کی اولاد میں سے کوئی اتنا ثروت مند، متحرک اور باعمل تھا کہ وہ منٹو کو کسی نہ کسی طور منظر نامے میں شامل رکھتا۔وہ نہ رائٹ میں تھا اور نہ لفٹ میں ۔ممتاز شیریں کے بقول نہ وہ نوری تھا ، نہ ناری۔وہ ایک سچا اور خالص فنکار تھا جو اپنی وفات سے دو دن قبل اپنے ہی گھر کے فرش پر لہو اگلتے ہوئے گجرات کی اس خاتون پر افسانہ لکھتا رہا کہ جس کے ساتھ درندہ صفت لوگوں نے زیادتی کی تھی۔علامہ اقبال نے تو تخلیقی دینا میں رہ کر کہا تھا کہ معجزہ ءفن کی خونِ جگر سے نمود ہوتی ہے ۔منٹو نے حقیقت کو میں بدل کر دکھایا کہ کس طور خونِ جگر سے فن کی نمود ہوا کرتی ہے۔

برصغیر کی تاریخ میں سماجی سطح پر ایک بڑی تبدیلی انگریزوں کی آمد پر ہوئی تھی کہ جس نے یہاں کی رسوم، زبان، ادب، سیاست ،تعلیم غرض ہر چیز کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔۱۸۵۷ء میں مغل حکومت کے خاتمے کے بعد یہاں کا سماج یکسر تبدیل ہوکر رہ گیا تھا۔اس حوالے سے منٹو کہتا ہے:

> اگر مغلئی حکومت کا دور دورہ ہوتا تو ممکن ہے میرے گھر میں ایک حرم سرا ہوتی نہ ہوتی کم از کم ایک بیوی گھر میں ہوتی اور دو تین طوائفیں میری ملازمت میں ہوتیں ۔مجھے بٹیریں لڑانے کا شوق ہوتا ۔ یہ مضمون پڑھنے کی بجائے میں پرنسپل صاحب کی شان میں ایک قصیدہ سناتا جو خوش ہو کر یا تو میرا منہ موتیوں سے بھر دیتے یا جوگیشوری کالج مجھے بخش دیتے تاکہ میں اسے طویلہ بنا سکوں ۔۔۔اس دور کا ادیب مطمئن انسان تھا ۔آج کا ادیب غیر مطمئن انسان ہے ، اپنے ماحول ، نظام ، اپنی معاشرت ، اپنے ادب حتیٰ کہ اپنے آپ سے غیر مطمئن انسان ہے۔اس کی اس بے اطمینانی کو غلط نام دے رکھے ہیں ۔[۱]

۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام کے بعد ادھر اور اُدھر جس نوع کی سماجی تبدیلیاں ہوئیں ،منٹو ان تبدیلیوں پر جی بھر کر خون کے آنسو رویا۔اس حوالے سے منٹو کے افسانوں میں ’’ سہائے‘‘،’’ ٹیٹوال کا کتا‘‘، ’’آخری سیلوٹ‘‘’’جھوٹی کہانی ‘‘اور’’ گورمکھ سنگھ کی وصیت‘‘ قابلِ ذکر ہیں۔منٹو نے ان افسانوں میں پاکستان اور ہندوستان کے بدلے ہوئے سماجی رویے کے پس پردہ تاریخ کے اس جبر کو موضوع بنایا ہے کہ جو ہمیشہ سے بڑے ادب کا موضوع رہا ہے۔’’گورمکھ سنگھ کی وصیت‘‘ کی آخری لائن معنی خیز ہے اور آپ ہم سب جانتے ہیں کہ منٹو اپنے افسانوں کی آخری سطور میں جھنجھوڑ کر رکھ دیتا تھا۔اپنے والد کی وصیت کے مطابق جب گورمکھ سنگھ کا بیٹا امرتسر کے شورش زدہ علاقے میں مسلمان جج کو عید کا تحفہ دے کر واپس پلٹتا ہے تو جج صاحب کے گھر سے چند گز کے فاصلے پر ڈھاٹا باندھے ہوئے آدمی اس سے سوال کرتے ہیں

’’ کیوں سردار جی، کر آئے اپنا کام‘‘

’’ سنتوکھ نے سر ہلا کر جواب دیا’’ ہاں کر آیا‘‘

اس آدمی نے ڈھاٹے کے اندر ہنس کر کہا’’ تو کر دیں معاملہ ٹھنڈا جج صاحب کا‘‘

''ہاں ۔۔۔جیسے تمھاری مرضی'' یہ کہہ کر سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا چل دیا''[۲]

اس افسانے کی آخری سطر میں'' جیسے تمھاری مرضی'' کے الفاظ میں منٹو نے اپنے عہد کا وہ کرب چھپا دیا تھا جو تاریخ کے جبر سے پیدا ہوتا ہے اور انسانی رویوں میں لاچاری اور وقت کے سامنے بے بسی کو نمایا ں کرتا ہے ۔ گورمکھ سنگھ کا لڑکا اس جلاؤ گھیراؤ کے عمل میں شریک نہیں ہوتا لیکن اس عمل کو روکنے پر قادر بھی دکھائی نہیں دیتا ہے۔''ٹیٹوال کا کتا'' اور'' آخری سیلوٹ'' بھی ایسے افسانے ہیں جن میں کشمیر کے محاذ پر لڑنے والے سپاہیوں کی مشترک یادیں ہیں،مشترک رومانس ہیں ،ایک دوسرے کے بغلی دوست وقت کے جبر تلے آ کر کس طرح ایک دوسرے پر بندوقیں تھامے کھڑے ہیں ۔

یہ کشمیر کی لڑائی بھی عجیب وغریب تھی ۔صوبیدار رب نواز کا دماغ ایسی بندوق بن گیا تھا جس کا گھوڑا خراب ہو گیا ہو۔۔۔دل میں بڑا ولولہ تھا، بڑا جوش تھا۔ بھوک پیاس سے بے پروا صرف ایک ہی لگن تھی ، دشمن کا صفایا کر دینے کی۔مگر جب اس سے سامنا ہوتا تو جانی پہچانی صورتیں نظر آتیں ۔بعض دوست دکھائی دیتے ، بڑے بغلی قسم کے دوست جو پچھلی لڑائی میں اس کے دوش بدوش اتحادیوں کے دشمنوں سے لڑے تھے۔[۳]

اسی افسانے میں جب ہنسی کھیل میں غلطی سے رب نواز کی گولی رام سنگھ کے پیٹ میں جا لگتی ہے تو ان دونوں میں مکالمے اس بدلے ہوئے سماجی اور سیاسی شعور کی قلعی کھول دیتے ہیں ۔

رام سنگھ خون میں لت پت پتھریلی زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی ۔رب نواز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹمٹا اٹھیں ۔مسکرا کر اس نے کہا '' اوئے کمھار کے کھوتے !یہ تو نے کیا کیا''رب نواز ، رام سنگھ کا زخم اپنے پیٹ میں محسوس کر رہا تھا لیکن وہ مسکرا کر اس پر جھکا اور دو زانو ہو کر اس کی پیٹی کھولنے لگا''خنزیر کی دم !تم سے کس نے باہر نکلنے کو کہا تھا۔[۴]

افسانے میں زخمی رام سنگھ اور رب نواز کے مابین یہ مکالمہ بھی معنی خیز ہیں :

''یارا ، سچو سچ بتا، کیا تم لوگوں کو واقعی کشمیر چاہیے''

رب نواز نے پورے خلوص کے ساتھ کہا ''ہاں رام سنگھا!''

رام سنگھ نے اپنا سر ہلایا ''نہیں ۔۔۔میں نہیں مان سکتا۔۔۔تمھیں ورغلایا گیا ہے''

رب نواز نے اس کو یقین دلانے کے انداز میں کہا ''تمھیں ورغلایا گیا ہے۔۔۔قسم پنجتن پاک کی''

رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ پکڑ لیا:''قسم نہ کھا یارا۔۔۔ٹھیک ہو گا''[۵]

افسانے کے آخر میں موت کی طرف جاتے ہوئے رام سنگھ کا اپنے سابق آفیسر میجر اسلم کو دیکھ کر سیلوٹ کرنا مشترکہ حافظے اور یادوں کی لوٹ کھسوٹ کا منظر نامہ بن جاتا ہے اور سلیوٹ کو اٹھا ہوا ہاتھ ڈھیلا پڑ جاتا ہے

اس کا سیلوٹ کرنے والا اکڑا ہوا ہاتھ ایک دم گر پڑا ۔جھنجھلا کر اس نے بڑبڑانا شروع کر دیا'' کچھ نہیں اوئے رام سیاں۔۔۔بھول ہی گیا تو سور کے نلا۔۔۔کہ یہ لڑائی ۔۔۔یہ لڑائی[۶]

''آخری سلیوٹ'' اور''یزید''میں گالیوں کا جوفرق دکھائی دیتا ہے، اس فرق سے بہت کچھ متعین ہو جا تا ہے۔یہ تو ایک وقت کا جبر سا ہے کہ جومنٹو کے افسانوں بالخصوص ''گورمکھ سنگھ کی وصیت''؛''ٹیٹوال کا کتا''اور''آخری سیلوٹ'' میں نظر آتا ہے کہ ان افسانوں کے کردار کچھ مشترکہ اثاثوں کے امین ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ غیض وغضب ، انتقام،نفرت ،دشمنی کی یہ فضا وقتی ہے اور کچھ وقت گزر جانے کے بعد یہ مشترکہ اثاثے دونوں اطراف کے دلوں کو جوڑ دیں گے ۔مشترکہ اثاثوں کی امانت داری کا امکان تب ختم ہوتا ہے جب بھارت پاکستان کے دریاؤں کا پانی بند کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان کے دریاؤں پر بھارتی ڈیم بنانے کے حوالے سے عالمی عدالت میں مقدمہ زیرِ سماعت رہا،تجزیہ کاروں نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ اگر پاکستان اور بھارت کی اگلی کوئی جنگ ہوئی تو وہ کشمیر کے مسئلے پرنہیں بلکہ پانی کے مسئلے پر ہوگی ۔یہ وقت کا جبرنہیں بلکہ اختیار ہے ۔آج اگر پاکستانی سماج میں بھارت کے خلاف نفرت کرکٹ میچوں،بارڈر پر پرچم اتارنے کی تقریب کے دوران مخالفانہ نعروں کی صورت میں سامنے نظر آتی ہے تو اس کا بہت حد تک بوجھ حکومتوں کے ان اختیاری فیصلوں پر پڑتا ہے کہ جن فرامین نے دوقوموں سے مشترکہ یادیں اور اثاثے چھین لیے ۔منٹو پھر بھی تخلیقی امکان کی بات کرتا ہے کہ ایک یزید نے پانی بند کیا تھا، دوسرا اسے کھولے گا۔

فسادات میں جوکچھ ہوا اور منٹو نے اسے جس طور لیا ، اس کی وضاحت کرنا ضروری نہیں کہ اس پر پہلے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، البتہ ایک آس کی نشان دہی کرنا ضروری ہے کہ جو راستے ہی میں کہیں دم توڑ گئی ۔منٹو کے افسانوی کردار بتاتے ہیں اور خود منٹو نے اپنے مضامین میں بہت سے مقامات پر اس آس مندی کا اظہار کیا کہ ان فسادات میں جو کچھ ہوا ، وہ ایک حادثہ تھا۔منٹو نے اپنے افسانوں میں چن چن کر ایسے کردار پیش کیے کہ جن کے عمل اور ردِعمل کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ سب وقتی اشتعال ہے۔''گورمکھ سنگھ کی وصیت'' میں موجود جج کی آس اور امید ،منٹو کی امید دکھائی دیتی ہے۔''شریفن'' کا باپ اپنی بیٹی کی برہنہ لاش کو دیکھ کر کھولتے ہوئے لاوے کی مانند سڑک پر نکلتا ہے لیکن ایک ہندولڑکی کی برہنہ لاش کو دیکھ کر اسے اپنی چادر سے ڈھانپ دیتا ہے تو منٹو کو امید دکھائی دیتی ہے ۔منٹو لکھتا ہے :

> اصل میں یہ چند لوگ ، یہ چند افراد ایک حادثے کی پیداوار تھے ۔یہ قتل وخون کے عادی نہیں تھے مگر حالات نے انہیں ایسا بنا دیا ۔وہ اپنی ماؤں سے پیار کرتے تھے ، دوستوں سے محبت کرتے تھے ، ان کو اپنی بہوبیٹیوں کی عزت و ناموس کا پاس تھا، ان کو خدا کا خوف بھی تھا مگر یہ سب ایک حادثے نے اڑا دیا۔[۷]

منٹو کا افسانہ''سہائے'' اس حوالے سے نہایت اہم افسانہ ہے کہ جس میں فسادات میں بدلتے ہوئے سماجی رویے کا بہت گہرائی میں جاکر تجزیہ کیا گیا ہے کہ ایک ساتھ رہنے والے ،بغلی قسم کے دوست ، پگڑی بدل رشتے ، ایک دوسرے کی عزت و ناموس کے محافظ کس طور اور کس وجہ سے آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اس افسانے میں چار دوستوں کے حلقے میں واحد مسلمان ممتاز ہوتا ہے کہ جس سے جگل کہتا ہے:

> ''میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ہمارے محلے میں فساد شروع ہو جائے تو میں کیا کروں گا''
>
> ممتاز نے اس سے پوچھا'' کیا کرو گے؟''
>
> جگل نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا'' میں سوچ رہا ہوں ۔بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں''

یہ سن کر ممتاز بالکل خاموش ہو گیا اور اس کی یہ خاموشی تقریباً آٹھ روز تک قائم رہی اور اس وقت ٹوٹی جب اس نے اچانک ہمیں بتایا کہ وہ پونے چار بجے سمندری جہاز سے کراچی جا رہا ہے'' [۸]

اس افسانے میں بمبئی سے روانہ ہوتے ہوئے ممتاز اپنی خاموشی توڑتا ہے اور کہتا ہے:

ہوسکتا ہے میرے ہم مذہب مجھے شہید کہتے ،لیکن خدا کی قسم اگر ممکن ہوتا تو میں قبر پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتا ۔ مجھے شہادت کا یہ رتبہ قبول نہیں ۔۔۔مجھے یہ ڈگری نہیں چاہیے ، جس کا امتحان میں نے دیا ہی نہیں ۔۔۔لاہور میں تمھارے چچا کو ایک مسلمان نے مار ڈالا۔۔۔تم نے یہ خبر بمبئی میں سنی اور مجھے قتل کر دیا ۔۔۔بتاؤ تم اور میں کس تمغے کے مستحق ہیں۔ [۹]

اسی افسانے کے آغاز میں منٹو نے بڑی دردمندی سے کہا'' یہ مت کہو ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں ۔۔۔یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں ۔۔۔اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دولاکھ انسان مرے ہیں ۔ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والا کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے ۔ [۱۰]

'' سہائے'' کے ممتاز اور اشوک کمار پر لکھے گئے خاکے میں موجود منٹو میں نہ جانے کیوں مجھے کچھ مماثلت سی محسوس ہوتی ہے۔''اشوک کمار'' میں منٹو نے اپنے آپ پر متعصب ہونے کے الزام لگنے کے بعد سوچا'' کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔آخر میں نے اپنے آپ سے کہا منٹو بھائی ۔۔۔آگے راستہ نہیں ملے گا۔۔۔موٹر روک لو۔۔۔ادھر باجو کے گلی سے نکل جاؤ'' [۱۱] اور میں چپ چاپ باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔منٹو کا خیال تھا:

ہم نے سوچا کہ تقسیم کے وقت یہ جو کچھ ہوا ہے، یہ انسانیت کے منہ پر جو کالک ملی گئی ہے، یہ جو ننگی عورتوں کے جلوس نکالے گئے ہیں ، یہ جو لاکھوں انسانوں کو ہلاک کیا گیا ہے، یہ جو ہزاروں عورتوں کی عصمت دری کی گئی ہے، اس کے بعد انسان کی بہمیت کی تشنگی کسی حد تک دور ہو جائے گی ۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مائل بہ ترقی ہے [۱۲]

منٹو کے عہد میں ایک پارٹی دوسری پارٹی کے مقابلے پر آتی تھی تو چھرے بھونکے جاتے تھے، سوڈے کی بوتلیں اور پتھر پھینکے جاتے تھے ۔آج ہم نے واقعی ترقی کر لی ہے۔اب ہم سوڈے کی بوتلیں نہیں ، ایک دوسرے پر دستی بم پھینکتے ہیں ۔خراج مانگتے ہیں ، نہ ملنے کی صورت میں اندھی گولی کا نشانہ بناتے ہیں۔آج ہم مسافروں کو بسوں سے اتار کر شناخت کرتے ہیں اور مرد و زن ، جوان اور بوڑھے کا امتیاز رکھے بغیر انھیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے ہیں ۔کچھ معلوم نہیں ہونے پاتا کہ کب کس کے ساتھ کیا ہو جائے ۔فسادات میں تشدد کی وجہ منٹو کو دکھائی دیتی ہے لیکن پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کے اندر مختلف گروہوں کے پارٹیوں درمیان متشددانہ فضا میں انسان کی بہمیت کی تشنگی کیوں دور نہیں ہونے پاتی ، یہ سوال منٹو کو بھی بے چین رکھتا ہے۔پاکستان کے سماج میں تشدد کی بڑھتی ہوئی لہر ایک خوفناک تبدیلی ہے کہ جو منٹو کے نوٹس میں آئی تھی اور منٹو کے بعد جس میں بے حساب اضافہ ہوا ہے۔

پاکستان بن گیا۔مہاجرین آباد ہوگئے ۔کہیں قبضے ہوئے ،کہیں الاٹمنٹوں کا بازار گرم ہوا۔خود منٹو کچھ دیر کے لیے الاٹمنٹیں کروانے والوں کے جھانسے میں آ گیا تھا لیکن انٹرویو میں اس نے سچ بولا کہ یہ سب کاغذات جھوٹے ہیں ۔وہ لوگ پھر بھی نہ سمجھے ۔ منٹو اس سچ کے عوض ان سے ایک چھاپہ خانہ مانگتا رہا لیکن اسے بدلے میں شورش کاشمیری کی شراکت میں ایک برف بنانے کا

کارخانہ الاٹ کر دیا گیا۔منٹو کے سچ کو پاکستان میں بھی قبول نہیں کیا گیا۔وہ لوگ فاتح رہے کہ جنہوں نے سچے جھوٹے پلندے جمع کروائے اور جاگیریں ، مکانات ، کارخانے ہتھیانے میں بامراد ٹھہرے۔آج ۲۰۱۲ء تک یہی روش ہے کہ جو چل رہی ہے۔منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' قابلِ ذکر ہے

> راستے میں کشمیری مزدور نے بارہا کہا :'' حضرت ، آپ مجھے کیوں پکڑتی ہے۔۔۔میں تو غریب آدمی ہوتی ۔۔۔چاول کی ایک بوری لیتی ۔۔۔گھر میں کھاتی ۔۔۔آپ ناحق مجھے گولی مارتی ''لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔تھانے میں کشمیری مزدور نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا''حضرت دوسرا لوگ بڑا بڑا مال اٹھاتی ۔۔۔میں تو فقط ایک چاول کی بوری لیتی ۔۔۔حضرت میں بہت غریب ہوتی ۔ ہر روز بھات کھاتی '' جب وہ تھک ہار گیا تو اس نے چاولوں کی بوری کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر تھانیدار کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہا'' اچھا حضرت ،تم بوری اپنے پاس رکھ۔۔۔میں اپنی مزدوری مانگتی ۔۔۔چار آنے[۱۳]

غور کرنے کی حاجت ہے اس سماج پر کہ جہاں اندھا دھندلوٹ کھسوٹ میں ہاتھ لگتا ہے تو ایک مزدور۔ ایک سال کے لیے جیل میں ڈالا جاتا ہے تو پھگو بھنگی کو جس نے دو دن کی بھوک سے لاچار ہو کر''ساڑھے تین آنے'' اس شخص کی جیب سے نکالے تھے جو اس کا مقروض ہوتا تھا۔

منٹو نے فسادات، مہاجرین کیمپ، عورتوں کی برآمدگی ، اپنوں کی مہربانیاں ، الاٹمنٹیں ۔۔۔سب کچھ دیکھا۔ایک ایسی قوم ، ایک ایسا خطہ جو اسلام کے نام پر قائم ہوا، جس کی تاریخ میں ہجرت اور ہجرت کے بعد مسائل سے نبرد آزما ہونے کی نہایت طاقت ور روایت موجود تھی، اس قوم نے مہاجرین کیمپوں میں اپنی بہو بیٹیوں کو دیکھ کر منہ پھیر لیا،کسی نے اپنے گھر کی فالتو چارپائی لا کر ان کیمپوں میں نہ رکھی ، کسی نے اپنے گھر کے ساتھ چھوڑے جانے والی حویلی کا قبضہ آنے والوں کے لیے نہ چھوڑا تو پاکستان میں ایک سماجی رجحان نے جنم لیا جس کے کچھ حصے منٹو کے ان اقتباسات میں ملاحظہ فرمائیں :

> پچھلے سال یومِ استقلال پر ایک صاحب سوکھا ہوا درخت کاٹ کر گھر لے جانے کی کوشش فرما رہے تھے ۔میں نے ان سے کہا'' یہ آپ کیا کر رہے ہیں ۔یہ درخت کاٹنے کا آپ کو کوئی حق نہیں'' آپ نے فرمایا'' یہ پاکستان ہے ، یہ مال ہمارا ہے۔میں خاموش ہو گیا۔[۱۴]
>
> ایک صاحب باہر لگے ہوئے فرش پر سے اینٹیں اکھاڑ رہے تھے ۔ میں ان سے کہا'' بھائی ، ایسا نہ کرو ۔ یہ بہت زیادتی ہے'' آپ نے ارشاد فرمایا'' یہ پاکستان ہے۔تم کون ہو مجھے روکنے والے'' میں خاموش ہو گیا۔[۱۵]
>
> مجھے پھر رونا آتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ اپنے گھر کے چوہے پکڑتے ہیں اور دوسرے محلے میں چھوڑ آتے ہیں ۔اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ نکالتے ہیں اور جھاڑو سے اپنے ہمسائے کے دروازے کے ساتھ لگا دیتے ہیں ۔کہتے ہیں کہ یہ سب حماقتیں تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہیں ۔ جب متفقہ یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے تو پھر یہ کیا حماقت ہے کہ تعلیم عام نہیں کی جاتی ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ لوگ جن کے ہاتھ میں عوام کو تعلیم دینے کا کام ہے، خود تعلیم یافتہ نہیں۔[۱۶]

پاکستان میں ایک سماجی تبدیلی یہ بھی ہوئی کہ اس ملک کے وسائل عوام پر خرچ کرنے کی بجائے اقتدار میں رہنے والوں پر خرچ کیے گئے خرچ کیا کیے گئے ، بہائے گئے اور بہائے جارہے ہیں ۔منٹو بھلے وقتوں میں اس دنیا سے اٹھ گیا تھا ،آج ہم اس عہد کو قدرے مثالیت پسندی کے ساتھ یاد کرتے ہیں ۔عوامی بہبود کا جو حال جتنا آج پتلا ہے،منٹو کے عہد میں اتنا نہیں تھا۔لیکن منٹو پھر بھی مطمئن نظر نہیں آتا۔وہ اپنے عہد کی سادہ زندگی میں وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم پر جھنجھلا اٹھتا ہے:

> میں جھنجھلا جھنجھلا جاتا ہوں۔۔۔ایک شخص وزیر بنتا ہے تو اس کے گھر کی طرف جو سڑک جاتی ہے ، اس پر ہر روز چھڑکاؤ شروع ہو جاتا ہے، اس کی صفائی کا خیال ہر دروازے کو رکھنا پڑتا ہے لیکن وہ مقامات جہاں صفائی اور چھڑکاؤ کی اشد ضرورت ہے ، ان کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا ۔ ایک وزیر کا حلق گرد و غبار کے باعث خراب ہو جائے یا دوسرے وزیر کو مچھر کاٹ جائے ، اس سے کیا ہوتا ہے وہ سیکڑوں اور ہزاروں بچے جو گندی موریوں کے تعفن آمیز فضا میں رہتے ہیں وہ ان وزیروں سے کہیں اہم ہیں ۔۔۔کیونکہ یہی وہ مخلوق ہے جو جنگ کے میدانوں میں اپنے سینے پر گولیاں کھاتی ہے اور فتح و شکست کا فیصلہ کرتی ہے۔[۱۷]

منٹو کا افسانے '' شہید ساز'' پڑھیں تو اس عہد میں ٹرسٹ ہسپتال، ٹرسٹ تعلیمی اداروں ، بیواؤں میں سلائی مشینوں کی تقسیم، آفات کے ماروں میں ٹی۔ وی کیمروں کی موجودگی میں اشیائے خور و نوش کو بانٹنے ،ٹرسٹ طعام گاہوں کے باہر لگی قطار میں ٹوکن تقسیم کرنے والوں کی اصل غایت سامنے آجاتی ہے۔''دوکانیں چل رہی ہیں ۔روپیہ اپنے آپ آرہا ہے۔میں نے الگ تھلگ ہو کر سوچنا شروع کیا اور بہت دیر بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ دل کی گڑبڑ صرف اس لیے ہے کہ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا۔''[۱۸]

اس افسانے میں منٹو نے نیک کاموں کے ان تمام امکانات کو پیش کیا ہے کہ جو ہم اس عہد میں بھی دیکھ رہے ہیں ۔بس شرط یہ کہ کام نیک ہو اور اس میں اپنا ہی بھلا ہو۔افسانے کے آخر میں تین سو مزدور زیرِتعمیر عمارت کے ملبے تلے دب کر دب جاتے ہیں اور مالک کو انشورنس کے اطمینان کے ساتھ قلبی سکون ہوتا ہے کہ سبھی شہید ہوئے۔گذشتہ دنوں میں اوپر تلے ایسے کئی سانحات سامنے آئے ہیں کہ آتش زدگی میں سیکڑوں مزدوروں کی جان گئی ۔

ہم حد درجہ عقیدت مند لوگ ہیں جس کا ایک بلیغ اشارہ بابو گوپی ناتھ میں بھی موجود ہے۔منٹو اس عقیدت کا قائل نہیں کہ جو یہ نہ جانتی ہو کہ اسے کس طرح بروئے کار لایا جائے۔اسی لیے منٹو ایک طور پر مسکراتے ہوئے کہتا ہے:

''اقبال نے خدا کے حضور دعا مانگی تھی ۔۔۔مرا نورِ بصیرت عام کردے۔۔۔یہ دعا جو ایک دردمند دل سے نکلی تھی ضرور قبول ہو گی ۔لیکن صابنوں ، تیلوں اور ہوٹلوں اور لانڈریوں کے ساتھ اس شاعرِ اعظم کا نام منسوب ہوتے دیکھ کر کبھی کبھی ایسا احساس ہوتا ہے کہ اس کا نورِ بصیرت بہت دیر تک جہالت کی تنگ اور اندھیری گلیوں میں بھٹکتا رہے گا۔''[۱۹] اور پھر منٹو بے منزل عقیدت کا ایک یہ پہلو بھی دکھاتا ہے''بھئی یہ مصطفیٰ کمال تو واقعی کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے۔۔۔میں تو جو صابن بنانے والا ہوں اس کا نام ''کمال سوپ'' رکھوں گا۔۔۔کیوں کیسا رہے گا؟ دوسرے نے جواب دیا وہ برا نہیں تھا ، جو تم نے پہلے سے سوچا تھا ،''جناح سوپ'' ۔۔۔یہ جناح مسلم لیگ کا بہت بڑا لیڈر ہے'' ۔[۲۰] جب ایک دوکان پر''جناح بوٹ ہاؤس'' لکھا دیکھ کر کبیرا روتا ہے تو کسی کو سمجھ نہیں آتا کہ کبیر کیوں رویا؟

منٹو نے مجید امجد کے بقول سماج اور ضمیر کے جن دھندلکوں اور روحوں کے عفریت کدوں میں لا کر ہمیں کھڑا کیا ہے، اب ہم انھیں غور سے دیکھ رہے ہیں، اب ''گستاخ منٹو'' پر ''تاخ تڑاخ'' نہیں ہو رہی۔ یہ ایک مثبت اشارہ منٹو نے سماجی تبدیلیوں کا کوئی طے شدہ فارمولا تجویز نہیں کیا اور نہ یہ اس کا م تھا۔ میرے خیال میں منٹو نے سماجی تبدیلی کی اگر بات کی بھی ہے تو اس میں ایک طرح سے خونی انقلاب کا سا منظر نامہ نظر آتا ہے کہ جب ان کے افسانے ''چوری'' کا مرکزی کردار نوجوانوں کے ایک ٹولے کو پورے خلوص سے مشورہ دیتا ہے:

> ہر وہ چیز جو تم سے چرا لی گئی ہے، تمھیں حق حاصل ہے کہ اسے ہر ممکن طریقے سے اپنے قبضے میں لے آؤ'' [۲۱] یا جب وہ بڑی دردمندی کے ساتھ کہتا ہے: ''یاد رکھئے وطن کی خدمت شکم سیر لوگ کبھی نہیں کر سکیں گے۔ وزنی معدے کے ساتھ جو شخص وطن کی خدمت کے لیے آگے بڑھے، اسے لات مار کر باہر نکال دیجیے۔۔۔ اگر کوئی ریشمی کپڑے پہن کر آپ کو غربت کا سدِ باب بتانے کی جرات کرے تو اس کو اٹھا کر وہیں پھینک دیجیے جہاں سے نکل کر وہ آپ لوگوں میں آیا تھا۔ یہ لیڈر کھٹمل ہیں جو وطن کی کھاٹ میں چولوں کے اندر گھسے ہوئے ہیں۔ ان کو نفرت کے ابلتے ہوئے پانی کے ذریعے باہر نکال دینا چاہیے۔۔۔ [۲۲]

منٹو ایسی سماجی تبدیلی کے بھی خلاف ہے کہ جس میں یہ ظاہر کیا جائے کہ مذہب خطرے میں ہے ''مذہب جیسا تھا ویسا ہی ہے اور ہمیشہ ایک جیسا ہی رہے گا۔ مذہب کی روح ایک ٹھوس حقیقت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ مذہب ایک ایسی چٹان ہے جس پر سمندر کی خشمناک لہریں بھی اثر نہیں کر سکتیں۔ یہ لیڈر جب آنسو بہا بہا کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ مذہب خطرے میں ہے تو اس میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ مذہب ایسی چیز ہی نہیں کہ خطرے میں پڑ سکے'' [۲۳]

منٹو نے مجید امجد کے بقول سماج اور ضمیر کے جن دھندلکوں اور روحوں کے عفریت کدوں میں لا کر ہمیں کھڑا کیا ہے، اب ہم انھیں غور سے دیکھ رہے ہیں، اب ''گستاخ منٹو'' پر ''تاخ تڑاخ'' نہیں ہو رہی۔ یہ ایک مثبت اشارہ ہے کہ ہم اب منٹو پر بات کر رہے ہیں۔ سہیل احمد خان کے بقول ''گستاخ منٹو'' کی جواب پذیری ہو رہی ہے۔۔۔ تو منٹو پوچھ رہا ہے کیا وہ ''نمرود کی خدائی'' تھی؟

حواشی و حوالہ جات

۱۔ منٹو، سعادت حسن: ''منٹو راما'' (افسانوی کلیات) لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۴، ص ۷۰۱

۲۔ منٹو، سعادت حسن: ''کلیاتِ منٹو'' (جلد سوم) مرتبہ ڈاکٹر ہمایوں اشرف، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵، ص ۱۵۵۱

۳۔ منٹو، سعادت حسن: ''کلیاتِ منٹو'' (جلد اول) مرتبہ ڈاکٹر ہمایوں اشرف، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵، ص ۶۵

۴۔ ایضاً، ص ۷۲

۵۔ ایضاً، ص ۷۳، ۷۴

۶۔ ایضاً، ص ۷۴

۷۔ منٹو، سعادت حسن: ''منٹو راما، ص ۳۰۶

۸۔ ایضاً، ص ۲۱

۹۔ ایضاً،ص۲۳

۱۰۔ ایضاً،ص۲۰

۱۱۔ منٹو، سعادت حسن:'' منٹو نما'' (افسانوی کلیات) لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز۲۰۰۳،ص ۱۷۶

۱۲۔ منٹو، سعادت حسن:'' منٹو راما'' ص ۳۰۶

۱۳۔ منٹو، سعادت حسن:'' منٹو نما'' ص ۷۵۵

۱۴۔ منٹو، سعادت حسن:''منٹو نامہ''،ص۳۵۳

۱۵۔ ایضاً،ص۳۵۴

۱۶۔ منٹو، سعادت حسن:''منٹو راما''،ص ۴۰۹

۱۷۔ ایضاً،ص ۴۰۹

۱۸۔ منٹو، سعادت حسن:'' منٹو کہانیاں''(افسانوی کلیات) لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز،ص۹۳

۱۹۔ منٹو، سعادت حسن:'' منٹو نما'' ص۴۳۳

۲۰۔ منٹو، سعادت حسن:'' کلیاتِ منٹو'' (جلد سوم) ص۱۶۲۳،۱۶۲۴

۲۱۔ منٹو، سعادت حسن:''منٹو راما''،ص۶۹۴

۲۲۔ منٹو، سعادت حسن:'' منٹو نما'' ص۵۷۳

۲۳۔ ایضاً،ص۵۷۲